پاکستان میں جمہوریت

ایک تاریخی جائزہ

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ،پاکستان
حسیب میموریل ٹرسٹ بلڈنگ، ناصر آباد، 2 کلومیٹر رائیونڈ روڈ، ٹھوکر نیاز بیگ،لاہور
فون نمبر:042-5311701-6 فیکس:042-5311710
ای میل:info@sappk.org

تحریر	:	ڈاکٹر طاہر کامران
ایڈیٹر	:	انور چودھری
سب ایڈیٹر	:	شبنم رشید
تعداد	:	5000(پانچ ہزار)
تاریخ	:	2007ء
قیمت	:	50روپے
کمپوزنگ	:	انجم شہزاد خان
لے آؤٹ	:	شمائلہ حسّان
ٹائیٹل /آرٹ ورک	:	محبوب علی
پرنٹر	:	جمال پرنٹر لاہور
ناشر	:	ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ،پاکستان

کینیڈین انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ ایجنسی (CIDA)اور
سوئس ڈویلپمنٹ کو آپریشن (SDC)کی مالی معاونت کا شکریہ

پیش لفظ

ساؤتھ ایشاء پارٹنر شپ،پاکستان نے "پاکستان میں جمہوری گورننس کی جدوجہد " کا آغاز کیا ہے۔ یہ پروگرام گزشتہ ایک سال سے ۔ ملک کے 40اضلاع میں چل رہا ہے۔اس میں دیہی مزدور کسان خواتین اور مردنیز اقلیتیں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اس پروگرام کے ذریعے ان میں اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہدپیدا کرنا اور انہیں اس قابل بنانا کہ وہ اپنے مسائل مقامی حکومتی نظام کے علاوہ صوبائی اور قومی سطح کے پالیسی ساز اداروں تک لے جا سکیں۔اس پروگرام کا مقصد مقامی حکومتی نظام میں جمہوری کلچر کو فروغ دینا بھی ہے تاکہ مقامی حکومتی اداروں کی کارکردگی کو بہتر بنایا جا سکے اور ا ان اداروں کے منتخب اراکین کو اپنے حقوق و فرائض سے نہ صرف آگاہ کیا جا سکے بلکہ ان کو اس پر عملدرآمد کے قابل بھی بنایا جا سکے۔ دیہی مزدور کسان عورتیں اورمرد پاکستان کی کل آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں۔قریباً67فیصد اور ان لوگوں کی اکثریت غربت کے مسائل سے دوچار ہے۔جب تک ان لوگوں کی رائے ملک کی سیاسی صورت حال میں اہمیت اختیار نہیں کرتی تب تک ان کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ایسا تبھی ہو سکتا ہے جب ملک میں جمہوریت اور جمہوری کلچر اپنی بنیاد مضبوط بنا چکے ہوں۔زیر نظر کتابچہ پاکستان میں

جمہوریت کی صورت حال کا تاریخی تناظر پیش کرتا ہے۔ہمارا مقصد یہ ہے کہ اِس تحریر کے ذریعے ہم دیہی مزدور کسان خواتین اور مرد وں میں جمہوری حقوق کی بحث کو آگے بڑھا سکیں۔ہمار ا یقین ہے کہ عوام ہی جمہوری تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرتے ہوئے ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

محمد تحسین

ایگزیکٹو ڈائریکٹر

ایس اے پی پاکستان

پاکستان میں جمہوریت ایک تاریخی جائزہ

پسِ نو آبادیاتی عہد میں پاکستانی ریاست اقتصادی بحران اور سیاسی ابتلاء سے عمومی طورپر نمٹنے میں ناکام رہی ہے۔ اپنی مختصر سی 59 برسوں پر محیط تاریخ میں اسے چار دفعہ فوجی آمریت کے مہیب سائے تلے کم و بیش 30برس بتانے پڑے اور طویل فوجی آمریتوں کے درمیانی وقفوں میں جمہوریت کو موقع دیا بھی گیا تو وہ استحکام حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ بیشتر سیاسی مبصر جمہوریت کے عمل کے توسط سے برسرِ اقتدار آنے والے سیاستدانوں کو بھی سویلین آمر ہی گردانتے ہیں۔ ۔متعدد بار انتخابات کا انعقاد بھی جمہوری تسلسل کو یقینی نہیں بنا سکا۔ پاکستان میں جمہوریت اور سیاست کے حوالے سے آئن ٹالبوٹ کا کہنا ہے کہ ”یہاں کی سیاست ہر دم بدلتے ہوئے اتحادوں اور گٹھ جوڑوں سے عبارت ہے۔یہاں پر نظریات یا جماعتی اداروں کی نسبت شخصیات کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں“۔[1]

ٹالبوٹ کا یہ کہنا بہت حد تک صحیح ہے کیونکہ تمام جماعتیں اور ان کی سیاست بہت حد تک کرشمائی شخصیتوں کے ارد گرد ہی گھومتی ہیں۔ یہ ان بنیادی وجوہات میں سے ایک ہے جو کہ جمہوریت کی راہ میں بڑی رکاوٹ تصور کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں نسل پرستی، مذہبی تعصب اور بنیاد پرستی ایسے رحجانات ہیں

جو جمہوری اداروں کے فروغ کے لیے کسی بھی طرح موافق نہیں ہو سکتے۔ اس سے بھی زیادہ اہم پاکستان میں سیاست پر برادری اور قبائلی بندھنوں کے گہرے اثرات ہیں جو کہ سیاسی سمت کو متعین کرنے والا ایک بڑا عنصر ہے۔ افسوس کہ جس طرح ہندوستان کی سیاست اور سماج پر ذات پات کے اثرات کا سیر حاصل تجزیہ کیا گیا ہے۔ پاکستانی سیاسی بساط اور معاشرتی تنظیم پر برادری اور خاندانی رشتوں کے اثرات ابھی تک تشنہء تحقیق ہیں۔ حمزہ علوی وہ دانشور ہیں جنہوں نے پنجاب کے بارے میں عملی تحقیق (Empirical Research) کی شروعات کی۔ گو کہ ڈیوڈ گِل مارٹن اور تھیوڈور رائٹ نے بھی سیاست میں برادری کے کردار پر خیال آرائی کی ہے۔[2] پاکستان میں جمہوریت کی نشوونما کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ بعض ریاستی اداروں کی ضرورت سے زیادہ افزائش کو بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس تھیوری کو کہ جس کے خالق حمزہ علوی ہی ہیں over-developed stateیعنی متجاوز کا ریاست کا نام دیا گیا ہے۔[3] چونکہ نو آبادیاتی عہد میں ریاستی طاقت اور کنٹرول کا زیادہ انحصار ریاست کے انہی اداروں پر ہوتا تھا جو بلاشبہ فوج اور سول بیوروکریسی تھے۔ ان اداروں کو عام طور پر عوامی و جمہوری تحریکوں کی بیخ کنی کے لیے استعمال میں لایا جاتا تھا اور انہیں وسیع اختیارات تفویض کر دئیے گئے تھے لہٰذا قبل از تقسیمِ ہند یہ

دونوں ادارے بہتر مالی وسائل، مؤثر تنظیم اور معاشرے کے بارے میں وسیع تر معلومات کے بل بوتے پر سیاسی کارکنوں اور جماعتوں کی اکثریت کو اپنے آمرانہ استبداد کا نشانہ بنائے رکھتے۔ پنجاب میں جلیانوالہ باغ میں کی جانے والی کاروائی اس بات کا بین ثبوت فراہم کرنے کے لیے کافی ہے کہ فوج کو انگریز نو آبادکاروں نے کس قدر ڈھیل دے رکھی تھی۔ اِن حالات میں مزاحمتی تحریک کا جنم لینا اور پروان چڑھنا اگر بالکل ہی ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نو آبادیاتی نظام کا تجربہ رکھنے والے معاشروں میں جمہوریت کا بیج ہمیشہ مزاحمت ہی کی سرزمین سے پھوٹا ہے اگر چہ پاکستان میں جمہوری تجربہ کی کامیابی کے لیے یہ اہم ترین لازمی شرط سرے سے ہی مفقود تھی۔ پاکستان بیسویں صدی میں برصغیر کے مسلمانوں کی موافقتی سیاست کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا چنانچہ بیشتر پسِ نو آبادیاتی معاشروں کی طرح پاکستان میں نو آبادیاتی نظام ہائے ریاست و حکومت کا تسلسل برقرار رہا۔ پاکستان میں فوج سول بیورو کریسی اور بالائی ریاستی ڈھانچہ انگریزی ہی کی یادگار ہے اور پاکستانی اہلِ دانش کو نہ تو ایسا ماحول میسر ہے اور نہ ہی وہ ایسی اہلیت سے متصف ہیں کہ کوئی متبادل نظام وضع کر سکیں جس میں عوام کی نمائندگی کو یقینی بنایا جا سکے۔چنانچہ پرانے حکومتی نظام پر اکتفا کر لینے ہی کو کافی سمجھ لیا گیا جس میں جمہوری اداروں کی حیثیت انتظامی اداروں

کے تابع تھی۔

پاکستان میں جمہوریت کی غیر یقینی اور عدم استحکام سے عبارت کہانی کی تفہیم تاریخی پس منظر میں ہی ممکن ہے۔ اگر بات نو آبادیاتی دور کے ہندوستان سے شروع کی جائے کہ جب یک سری (Autocracy) طرزِ حکومت کو برقرار رکھتے ہوئے انگریز حکمرانوں نے جمہوری اداروں کو بھی متعارف کروانے کی کوشش کی البتہ آئن ٹالبوٹ کا کہنا ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی کونے میں جو بعد ازاں پاکستان بنا نو آبادیاتی حکمتِ عملی نمایاں طور پر مختلف تھی۔ یہاں پر مقامی لوگوں کے لیے سیاسی شراکت کا موقع بہت کم تھا اور اس علاقے میں پولیس کے اختیارات کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کو ایمرجنسی کے نفاذ کے خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے۔[4] پنجاب تو 1849ء میں الحاق کے بعد تقریباًبارہ برس تک 'سرزمینِ بے آئین' رہا۔ وہاں پر ڈپٹی کمشنر ضلع کا مطلق العنان حکمران ہوا کرتا تھا جسے انتظامی اختیارات کے ساتھ ساتھ عدالتی فرائض بھی تفویض کر دئیے گئے تھے۔ شمال مغربی علاقہ جات کی قبائلی معاشرت کے ساتھ ساتھ وسطِ ایشیاء کے ذریعے سے روس کے ہندوستانی علاقے کی جانب بڑھنے کے عزائم نے انگریز حکمرانوں کو اس علاقے میں آمرانہ سختی پر مائل کر دیا تھا۔

علاوہ ازیں ہندوستان کے شمالی و مشرقی علاقوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے کی بڑی وجہ معاشی تھی جبکہ وہ علاقے جو

1947ء کے بعد پاکستان کا حصہ بنے سٹریٹیجک وجوہات کی بناء پر سلطنتِ برطانیہ کی قلمرو میں شامل کیے گئے۔ اس لیے وہ سیاسی و اقتصادی لبرل ازم (یعنی آزادانہ تجارت اور قانون ساز کونسلوں کا قیام وغیرہ) جس کی ترویج بنگال، مدراس اور بمبئی میں ہوئی پنجاب ، سندھ اور شمال مغربی صوبے میں ناپید تھی۔ اگرچہ مشرقی بنگال جسے بعد میں مشرقی پاکستان کا نام دے دیا گیا تھا اس سے مستثنیٰ تھا۔ 1757ء میں جنگِ پلاسی اور اس کے تقریباً 5 برس بعد بکسر کی جنگ میں یکے بعد دیگرے فتح پا لینے کے بعد 1765 ء میں دیوانی کے اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی نے خود ہی سنبھال لیے۔ بنگال کے انتظامِ حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کا محرک کمپنی کے معاشی مفادات تھے نہ کہ دفاعی مجبوریاں جیسا کہ شمال مغربی علاقوں کے حوالے سے تھا۔[5]

اس کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی حکمرانوں نے سنٹرل کنٹرول کے نظام کو جدید خطوط پر منظم کیا۔ ریلوے ڈاک کے نظام اور بہترذرائع آمدورفت ورسل و رسائل کے ذریعے سے ہندوستان جیسے متنوع رنگ و نسل ، کلچر اور مذاہب کے لوگوں کو ایک ہی مرکز پر لا کر نہ صرف سیاسی و اقتصادی بلکہ کلچر کی سطح پر بھی اپنے تابع کرنے کی کوشش کی گئی جو کہ اکثر علاقہ جات میں تو کافی کارگر ثابت ہوئی۔ سی اے بیلی اور برنارڈ کوہن کی تحقیق اس نکتے کو بہت حد تک اجاگر کرتی ہے۔ [6] مقامی نظام ہائے تعلیم و علمی

ذخائر کو بھی اپنے قبضے میں لا کر نو آبادیاتی مفادات کے مطابق نئی نئی تشریحات کی گئیں۔ جیمز مل، ایلیئٹ اور ڈائوسن نیز رچرڈ ٹمپل لاک ووڈ کپلنگ کے ساتھ ساتھ ابسٹن، تھوربرن اور میلکم ڈارلنگ وغیرہ نے مقامی لوگوں کو بہت حد تک یہ باور کروا دیا تھا کہ برصغیر کی پرانی روایات، علم اور طرزِ بودوباش پسماندگی اور سراسر جہالت کا مظہر ہے اور انگریز ہی انہیں جدت پر مبنی تہذیب و ترقی سے آشنا کر سکتے ہیں اس طرح انگریز افسروں کا مائی باپ کے امیج (patronalistic image) کو مقامی لوگوں کے اذہان میں راسخ کر دیا گیا۔[7] طبقہء امراء تو انگریزوں کی ثقافتی برتری کا غیر مشروط طور پر قائل ہو گیا تھا۔ نہ صرف انگریزی زبان اور علم و ادب بلکہ نظامِ ریاست بھی وہی زیادہ بہتر اور کارآمد قرار دیا گیا جس میں انتظامی و فوجی افسروں کو عوامی نمائندوں کی نسبت بہتر مخلوق گردانا گیا۔ خاص طور پر ایسے عوامی نمائندے جو انگریزی سامراج کے مخالف تھے انہیں قیدو بند کی صعوبتوں کے ساتھ ساتھ معاشرتی اطراف پر پھینک دیا گیا۔ ہندوستان میں آل انڈیا کانگرس یا پھر سوشلسٹ آئیڈیالوجی سے متاثر افتادگانِ خاک (Wretched of the Earth) کی نمائندہ تنظیمیں استثنائی حیثیت کی حامل تھیں۔ لیکن پنجاب سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں تمام تر انتظام انتظامیہ اور فوج کے افسران مقامی با اثر زمینداروں، سرداروں اور وڈیروں کی معاونت سے چلایا جا تا تھا۔ یہی وہ عناصر

تھے جو پاکستان کے تشکیل پا جانے کے بعد بھی اقتدار کی کرسی سے چمٹے رہے۔ لمحہء موجود تک ریاستی انتظام اسی گٹھ جوڑ کے قبضے میں ہے۔ صحیح معنوں میں انتخابی سیاست کے ذریعے سے آنے والے سیاسی عناصر کو ذلیل و رسوا کر کے اقتدار اور عوامی اعتماد سے محروم کرنا ان کے لیے چنداں مشکل نہیں۔

عائشہ جلال کا کہنا کہ تحریکِ پاکستان کے دور میں محمد علی جناح کو بالآخر (خاص طور پر 1942ء کے بعد کہ جب پنجاب میں سر سکندر حیات کا انتقال ہو گیا تھا) مسلم سیاست میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اسی لیے انہیں عائشہ sole spokesman کہتی ہے۔[8] راقم کے خیال میں قیامِ پاکستان کے بعد بھی محمد علی جناح نے عملی طور پر ریاستی انتظام و انصرام میں اپنی مرکزی حیثیت کو برقرار رکھا حالانکہ گورنر جنرل کے عہدے پر متمکن ہو کر آئینی طور پر ان کی حیثیت و عہدہ ریاستی امور میں کسی بھی طرح کی دخل اندازی کا متقاضی نہ تھا۔ پارلیمانی روایت میں سربراہِ حکومت وزیرِ اعظم ہوا کرتا ہے لیکن جناح نے اِس روایت کو پسِ پشت ڈال دیا اور بقول خالد بن سعید وہ دنیا کے سب سے بااختیار گورنر جنرل بن گئے۔[9] اُن کا کہنا ہے ''جہاں تک پاکستان کی نئی ریاست اور اس کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کا سوال تھا جناح کا نقطہ نظر اس بارے میں بہت واضح تھا کہ وہ برطانیہ کی پارلیمانی روایات پر سختی سے کاربند رہیں گے چنانچہ انہوں نے گورنمنٹ آف

انڈیا ایکٹ 1935ء کا نفاذ کیا حالانکہ یہ قانون قطعی طور پر مرکزیت کا حامل تھا۔ وہ یہ بھول گئے کہ مختلف تہذیبوں اور روایات کے حامل خطوں پر مشتمل اس قطعہ اراضی پر ایسا قانون نافذ کیا جا رہا تھا جو مضبوط مرکزیت کا مکمل طور پر غماز تھا۔ لہٰذا جناح نے چار میں سے تین صوبوں میں پرانے انگریز بیوروکریٹوں کو گورنر مقرر کر دیا جو اپنے صوبوں کی رپورٹیں براہِ راست گورنر جنرل کو بھیجتے تھے نہ کہ وزیرِ اعظم کو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر اور سب اعلیٰ افسرہدایات و احکام کے لیے گورنر جنرل سے رجوع کرنے لگے۔"[10]

لارڈ مائونٹ بیٹن جو دونوں مملکتوں یعنی ہندوستان اور پاکستان کے بیک وقت گورنر جنرل بننے کا خواہش مند تھا۔ اُس نے جب جناح کو قائل کرنے کیلئے کہا ۔۔پارلیمانی طرزِ حکومت میں اختیارات کا منبع وزیرِ اعظم ہوتا ہے۔ آپ وزیرِ اعظم بن جائیں۔ گورنر جنرل کا عہدہ محض آئینی ہوتا ہے اس کے پاس انتظامی اختیارات نہیں ہوا کرتے تو جناح نے جواب دیا "میری پوزیشن یہ ہو گی میں ہدایت جاری کروں گا اور دوسرے اس پر عمل کریں گے"

اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کی پہلی کابینہ جناح نے خود تشکیل دی۔ وزراء کا تقرر اور اُن کے محکمے خود ہی تجویز کیے۔ کابینہ کی پالیسیاں بھی خود تشکیل دیں۔ حتی کہ وزیرِ اعظم کی غیر حاضری میں کابینہ کا اجلاس طلب کر لیا کرتے اور وزیرِ اعظم کی موجودگی یا غیر موجودگی سے قطع نظر کابینہ کے اجلاسوں کی

صدارت بھی خود ہی کرتے۔مرکزیت ہی کی خواہش کے نتیجے میں آمریت کی راہ ہموار ہوئی اور اس کا پہلا نشانہ صوبہ سرحد کی حکومت بنی جسے قیامِ پاکستان سے قبل بھی اور بعد میں بھی عدم اعتماد کے آئینی طریقے سے ہٹانا ممکن نہیں تھا۔ مرکزیت پسندی کے حوالے سے حمزہ علوی ایک اور ادارے کی جانب توجہ دلاتے ہیں جسے جناح نے خود ہی قائم کیا تھا۔ یہ ادارہ پارلیمانی کمیٹی کہلاتا تھا۔[11] تمام فیڈرل سیکرٹری اس کمیٹی کے ارکان تھے اور چوہدری محمد علی کو سیکرٹری جنرل کا عہدہ تشکیل دے کر اس کمیٹی کا منتظم بنا دیا گیا تھا۔ یہ کمیٹی اور سیکرٹری جنرل گورنر جنرل کو براہِ راست جوابدہ تھے اور ریاستی امور سے متعلق تمام اہم فیصلے کمیٹی ہی گورنر جنرل کی صدارت میں کیا کرتی تھی۔ کابینہ کا کام محض ان فیصلوں کی توثیق کرنا ہوتا تھا۔ وزراء کو زیادہ سوال جواب کرنے کی چھوٹ نہ تھی۔ جناح کے انتقال کے بعد ان پر کڑی نظر رکھنے والا کوئی نہ رہا لہذایہی بیوروکریٹ منہ زور گھوڑے کی طرح بے قابو ہو گئے اور 8 195ء تک پاکستان کی عنانِ اقتدار اسی طبقے کے ہاتھ میں رہی۔ جب 1951ء میں ایوب خان افواجِ پاکستان کے پہلے پاکستانی کمانڈر ان چیف بنے تو انہوں نے بھی سیاست و حکومت کے کاروبار میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور جلد ہی سول بیوروکریسی اور فوجی اعلیٰ قیادت کا گٹھ جوڑ ظہور میں آ گیا۔

یاد رہے اِن دونوں اداروں کے مفادات زمیندار طبقے کے مفادات سے بہت حد تک ہم آہنگ تھے۔ ہر سول سروس کے اہلکار یا پھر فوجی کو انگریزوں ہی کے زمانے سے زرعی اراضی کے قطعات دیئے جاتے تھے اور پاکستان بننے کے بعد یہاں کا مقتدر طبقہ انہی عناصر کا مجموعہ تھا جنہوں نے نہ صرف عوامی سیاست بلکہ ہر طرح کی ترقی پسندانہ روش کے خلاف صف آراء ہو کر فکری طور پر قدامت پرستی اور سیاسی و سماجی طور پر سکوت و جمود کو قائم رکھنے کی حتی الامکا ن کوشش کی۔ یہ مقتدر طبقہ جس میں بیوروکریسی کو خاص طور پر 1958ء تک بالادست حیثیت حاصل رہی تھی اگرچہ اس کا ابتداء ہی سے ریاست پر بہت حد تک قبضہ تو ہو چکا تھا لیکن لیاقت علی خان کے قتل کے بعد اس کے نمائندے کھل کر سیاسی منظر نامے پر آن دھمکے۔ ملک غلام محمد، چوہدری محمد علی، سکندر مرزا اور ایوب خان 1958ء تک کے سیاسی رویوں کو تشکیل دینے کے مکمل طورپر ذمہ دار تھے۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے توقیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی تنظیمی طور پر یہ جماعت بکھر کر رہ گئی۔ نہ تو پاکستان بننے سے قبل لیگی لیڈر شپ کے پاس ریاستی امور کو چلانے کے لیے کوئی بلیو پرنٹ تھا اور نہ ہی ملک بن جانے کے بعد اس طرف کوئی توجہ دی گئی۔ اِن حالات میں سیاسی خلا کا پیدا ہو جانا فطری امر تھا جسے غیر سیاسی عناصر نے پُر کیا۔ جس سے جمہوریت نو آبادیاتی

دور کے وارثوں کے مفادات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ غیر سیاسی عناصر کی غیر معمولی طاقت و رسوخ کے ہوتے ہوئے جمہوری اداروں کا قائم ہونا محض دیوانے کا خواب تھا۔ ان اداروں کا پروان چڑھنا تو دور کی بات تھی نہ انتخابات ہو سکے کیونکہ فوجی کی اعلیٰ کمان اور بیوروکریٹوں کا کوئی حلقہ انتخاب نہ تھا لہٰذا انتخابات کے انعقاد کی صورت میں انہیں اپنے اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ آئین بھی کم و بیش انہی وجوہات کی بناء پر نہ بن سکا۔ مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والی متوسط طبقے کی نمائندہ سیاسی قیادت اور پختون و سندھی صوبائی خود مختاری کی حامی تحریکوں کے باعث پاکستان کے غیر سیاسی مقتدر طبقے کی حاکمانہ حیثیت کو سخت خطرہ لاحق تھا لہٰذا پاکستان جیسے انتہائی متنوع ملک کو مرکزیت کے استبداد کامسلسل نشانہ بنایا گیا۔ حتی کہ 1970ء میں اسی رویے کے باعث مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا۔ لیکن ستم ظریفی ملا حظہ ہو کہ ابھی بھی مضبوط مرکز ہی کو پاکستان کی سا لمیت سے لازم قرار دیا جاتا ہے۔

مرکزیت کو دوام دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک زبان کو پوری قوم کی نمائندگی کا فرض سونپ دیا جائے اور وہی خطے میں پائے جانے والے مختلف کلچرز کی ترجمانی کرے۔ اسے علاقائی مقامی زبانوں کے مقابلے میں حکومتی سطح پر ترجیح بھی دی جاتی ہے۔ پاکستان میں یہ مقام اردو کو دیا گیا۔ قیامِ پاکستان سے

قبل ہی اردو کو برصغیر کے مسلمانوں کے مشترکہ ثقافتی ورثے کی علامت قرار دے دیا گیا تھا غالباً اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تحریکِ پاکستان کی قیادت زیادہ تر یو پی اور بہار کی اشرافیہ کے پاس رہی جن کی زبان اردو تھی علا وہ ازیں 19ویں صدی سے اس زبان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ جس کی ترویج و ترقی میں انگریز سرکار کی انتظامی حکمتِ عملی کا بھی بہت حد تک دخل تھا۔[12]جو فارسی کے متبادل کے طور پر اردو ہی کی جیسی زبان کی متلاشی تھی۔ جسے مختلف اوقات میں ہندی، ہندوی یا ریختہ جیسے کئی ناموں سے پہچانا جاتا تھا۔ گو کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ رسم الخط میں اختلاف پیدا ہو جانے کی وجہ سے یہی زبان مسلمانوں اور ہندوئوں میں تنازعے کا باعث بن گئی اور اگر پاکستان میں تاریخ، مطالعہ پاکستان ، سیاسیات وغیرہ کی نصابی کتب کا جائزہ لیا جائے تو ہندو مسلم اختلافات کا آغاز ہی 1867ء میں ہونے والے اردو ہندی تنازعے سے کیا جاتا ہے جس کے بعد مسلمانوں کو اپنی علیحدہ ثقافت اور تہذیبی ورثے کی صحیح طور پر پہچان ہوئی اور برصغیر میں رہنے والی یہ دو بڑی قومیں علیحدگی کے راستے پر چل نکلیں۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو اردو کی متنازعہ حیثیت اس طرح بڑھ گئی کہ بنگالی متوسط طبقہ اسے قومی و سرکاری زبان تسلیم کرنے پر قطعاً تیار نہ تھا۔ لیکن پاکستانی قیادت اردو ہی کی

سرکاری حیثیت پر مصر رہنے سے بعد ازاں برآمد ہونے والے اثرات کا صحیح اندازہ ہرگز نہ کر سکی۔ یہ مسئلہ قیامِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ تب منظرِ عام پر آیا جب فروری 1948ء میں مرکزی اسمبلی میں اردو اور انگریزی زبان کے ساتھ بنگالی کو بھی سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ جواباً وزیرِ اعظم لیاقت علی خان نے اردو کو مسلم اوربنگالی کو غیر مسلم قراردیتے ہوئے اس کی شدید مخالفت کی اور زور دے کر کہا کہ پاکستان کی قومی زبان صرف اردو ہو گی۔ اس بیان کی مشرقی بنگال میں شدید مذمت کی گئی۔ بنگالی متوسط طبقہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ان کی مادری زبان کو نظر انداز کر کے اُن سے بے انصافی کی جا رہی ہے۔ حتی کہ جب قائدِ اعظم نے مارچ 1948ء میں مشرقی بنگال کا دورہ کیا تو صوبائی حکومت کی طرف سے پوری کوشش کی گئی کہ یہ معاملہ کسی طرح سے گوشہ فراموشی میں دبا دیا جائے لیکن زبان کے مسئلے کی گونج باقی رہی۔ تبھی ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے بھی دو ٹوک انداز میں یہ کہہ دیا کہ' یہ فیصلہ صوبے کے عوام نے خود کرنا ہے کہ ان کے صوبے کی زبان کون سی ہو لیکن پاکستان کی سرکاری زبان صرف اردو ہو گی'۔ [14]
علی ہذالقیاس زبان کا یہ قضیہ اپنی تمام تر پیچید گیوں سمیت برقرار رہا بلکہ اس کی حساسیت اور اس سے جنم لینے والے تباہ کن اثرات میں زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ جب

سامنے آئی جس میں اردو زبان کی قومی و سرکاری حیثیت کا اعادہ کیا گیا تھا تو مشرقی بنگال کے حالات میں مزید ابتری آئی اور متعدد بنگالی ہنگاموں میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ گو کہ 1956 ء کے آئین میں بنگالی کی جائز حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ مغربی اور مشرقی بنگال میں اختلافات کی شروعات نما ئند گی کے مسئلے کے بعد اردو بنگالی تنازعے سے ہی ہوئی جو کہ با لا خر پاکستان کے دولخت ہونے پر منتج ہوئی لیکن پاکستانی مقتدر طبقے نے اس قومی المیے سے قطعاً کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اردو جو کہ محض 9.5 فیصد لوگوں کی مادری زبان ہے اگر اس کی قومی حیثیت پر اصرار کیا بھی جائے تو بھی علاقائی ثقافتوں اور زبانوں کے expense پر ایسا کرنانا قرینِ مصلحت اقدام ہو گا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ پاکستان کو بنے ابھی بمشکل ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ 22 اگست 1947 ء کو سرحد میں قائم ڈاکٹر خان صاحب کی سرخپوش وزارت کو برطرف کر دیا گیا۔[15] اور وہاں پر خان عبدالقیوم خان کی غیر نمائندہ حکومت قائم کر دی گئی۔ 55-1947ء کے دوران صوبہ سرحد میں تین بار وزارت برطرف ہوئی لیکن ایک بار بھی اسے آئینی طور پر عدمِ اعتماد کے ذریعے نہیں ہٹایا گیا۔ یہ عمل محض صوبہ سرحد تک ہی محدود نہ رہا بلکہ باقی صوبوں میں بھی وزارتوں کو برخواست کر کے سیاسی عدم استحکام کی راہ ہموار کر دی گئی۔پنجاب میں ممدوٹ وزارت کا خاتمہ

محض اس وجہ سے کیا گیا کہ لیاقت علی خان ایسا چاہتے تھے۔ [16]
سندھ میں ایوب کھوڑو کی وزارت کے ساتھ بھی یہی حشر ہوا۔[17]
دراصل لیاقت علی خان بذاتِ خود پاکستان میں تادمِ زیست عدم تحفظ کا شکار رہے کیونکہ پاکستان میں ان کا حلقہ انتخاب سرے سے موجود ہی نہ تھا کیونکہ وہ یوپی کے رہنے والے تھے یہی وجہ تھی کہ 1947ء میں ہندوستان سے آنے والے مہاجروں کی اکثریت کو انہی کے ایماء پر کراچی میں بسایا گیا تا کہ انتخابی عمل کے جاری ہونے پر انہیں حلقہ انتخاب میسر آسکے۔ قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد انہوں نے وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ ساتھ 8اکتوبر1950ء میں مسلم لیگ کی صدارت کا عہدہ بھی سنبھال لیا جو کہ سیاسی طور پر کمزوری کی علامت تھی۔ انہوں نے لیگ کا صدر بننے سے پہلے لیگ کونسل سے جماعت کے آئین میں سے وہ دفعہ منسوخ کروالی تھی جس کے تحت یہ قرار دیا گیا تھا کہ کوئی صوبائی یا مرکزی وزیر مسلم لیگ کا عہدیدار نہ ہو سکے گا۔ ان کے اس عمل سے پاکستان میں یک جماعتی راج کی روایت پختہ تر ہو گئی۔ حکومت ریاست اور مسلم لیگ لازم و ملزوم نظر آنے لگے۔ 8اکتوبر 1950ء کو مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے مسلم لیگ کو پارلیمنٹ پر برتری دے دی۔ انہوں نے کہا:اب مسلم لیگ کونسل کی اہمیت پارلیمنٹ سے کہیں بڑھ کر ہے لہٰذا یہاں جو لفظ بھی کہا جائے وہ اس کے وقار اور ذمہ داری کے مطابق

ہونا چاہیے۔ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے اور میرا ہمیشہ یہی پختہ عقیدہ رہا کہ نہ صرف لیگ کا وجود بلکہ اس کی قوت پاکستان کے وجود اور قوت کے برابر ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ابتداء ہی میں یہ فیصلہ کر لیا تھا اور اب میں اپنے اس فیصلے کی پھر تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو لیگ کا وزیرِ اعظم سمجھا ہے۔ میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا منتخب وزیرِ اعظم تصور نہیں کیا۔ [18] ان حالات میں پارلیمانی جمہوریت کا جڑ پکڑنا ممکن نہ تھا۔

لیاقت علی خان کا حزبِ اختلاف سے متعلق رویہ بھی ان کی کمزوری اور عدم تحفظ پر دلالت کرتا ہے جس کی طرف نوائے وقت نے بھی اشارہ کیا خاص طور پر جب قائدِ اعظم کی دوسری برسی 11ستمبر1950ء کے موقع پر انہوں نے حسین شہید سہروردی اور دیگر رہنمائوں کے بارے میں انتہائی سخت اور ناشائستہ زبان استعمال کی۔ انہوں نے کہا ''پاکستان کے دشمنوں نے ان کتوں کو کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ غدار، جھوٹے اور منافق ہیں''۔اس طرح کی غیر جمہوری طرزِ سیاسست کی ابتداء تو ہمارے صفِ اول کے سیاسی قائدین ہی کی طرف سے کر دی گئی تھی۔ ان کے اس طرزِ سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کسی مزاحمتی یا احتجاجی سیاست کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ حصولِ پاکستان انگریز

سرکار ہی کی شرائط کو دھیان میں رکھتے ہوئے مذکرات کے ذریعے ممکن ہوا تھا۔ اس موافقتی سیاست پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے پاکستان کے ابتدائی ایام میں وہ سیاسی کلچر جنم نہ لے سکا جس میں صحت مند جمہوری رویہ پنپ سکتا اور لیاقت علی خان کو بھی PRODA [19]جیسے قوانین کا سہارا لے کر ناپسندیدہ عناصر کا اپنے تئیں قلع قمع کرنے میں کسی قسم کی خلش کا احسا س نہ ہوا۔

عام طور پر 1947ء سے 1958ء تک کے عہد کو سیاسی عہد کا نام دیا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ قائدِ اعظم، لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین سیاست دان ہی تھے لیکن اس حقیقت کو دہرانے میں کوئی باک نہیں کہ ریاستی امور پر بیوروکریٹوں کی مکمل گرفت تھی اور اہم پالیسیوں کو طے کرنے نیز اہم و غیر اہم کا فیصلہ کرنے کے حقیقتاً مجاز بیوروکریٹ ہی تھے اس لیے اس نو سالہ دور کو نوکر شاہی کا عہد کہا جانا چاہیے۔ اگرچہ 1951ء تک حکومتی سربراہ سیاست دان ہی رہے لیکن اس کے بعد اس تکلف کی بھی ضرورت نہ رہی ملک غلام محمد جو کہ پاکستان کے پہلے وزیرِ خزانہ تھے گورنر جنرل بن بیٹھے اور جب بوجہ بیماری انہیں یہ عہدہ چھوڑنا پڑا تو سکندر مرزا ان کے جانشین کے طور پر آن دھمکے۔ جب بھی ان حضرات کو یہ تاثر ملتا کہ آئین ساز اسمبلی دستور

سازی کی جانب قدم بڑھا رہی ہے تو یہ سدِ راہ بن جاتے۔ ملک غلام محمد کی طرف سے 1954ء میں دستور ساز اسمبلی کا توڑا جانا اور مولوی تمیز الدین کیس میں عدالتوں پر دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کے فیصلے کروا لینا خالصتاً آمرانہ مزاج کی غمازی کرتا تھا [20]یا پھر سکندر مرزا کا راتوں رات ری پبلکن پارٹی بنوا لینا یہ واضح کرنے کے لیے بہت کافی ہیں کہ ابتدائی نو برسوں کا عہد درحقیقت نوکر شاہی کا عہد تھا۔ 8 اکتوبر 1958ء کا فوجی انقلاب سکندر مرزا ہی کی آمرانہ سوچ کا شاخسانہ تھا۔ فوجی آمریت پر مزید رائے زنی کرنے سے پہلے دو اہم واقعات کا ذکر کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے ایک تو 1954ء میں مشرقی بنگال میں منعقد کروائے گئے انتخابات کا واقعہ تھا۔ ان صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کو سخت حزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ 310 نشستوں میں سے محض دس نشستیں حاصل کر سکی۔ جبکہ جگتو فرنٹ کو عدیم المثال کامیابی حاصل ہوئی لیکن مرکزی حکومت میں براجمان غیر سیاسی مقتدر ٹولے نے انتقالِ اقتدار میں رخنے ڈالنے شروع کر دیے اور بجائے اس کے کہ نمائندہ حکومت کو صوبے کی باگ ڈور دے دی جاتی سکندر مرزا کو وہاں گورنر بنا کر بھیج دیا گیا اور تمام انتظامی اختیارات بھی اسے ہی سونپ دیے گئے۔[21]

دوسرا اہم واقعہ 1956ء کا آئین تھا جس میں 'برابری کا اصول' (principle of parity) اور ون یونٹ (one unit) [22]جیسے اقدامات

کے ذریعے مشرقی بنگال کے باسیوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیا گیا۔ یاد رہے مشرقی بنگال میں پاکستان کی کل آبادی کا 56فیصد حصہ سکونت پذیر تھا۔ لیکن شروع سے ہی مرکز میں سول بیوروکریٹوں، بڑے بڑے زمینداروں اور فوج کو یہی خدشہ بدستور لاحق تھا کہ اگر بنگالی اقتدار میں آگئے تو ان کی مقتدر حیثیت اور مراعات جاتی رہیں گی۔ چنانچہ مغربی پاکستان میں تینوں صوبوں اور بلوچستان کو ضم کر کے ایک صوبہ بنا دیا گیا تاکہ بنگالی اکثریت کے مقابلے میں مغربی پاکستان کی سیاسی پوزیشن بہتر ہو سکے اور اس کے بعد دونوں حصوں کو پارلیمنٹ میں برابر نشستیں مختص کر دی گئیں۔ اس طرح نو سالوں بعد جو پہلا آئین بنا وہ بذاتِ خود غیر جمہوری اساس رکھتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ یہ آئین وہ تقدس نہ پا سکا اور دو سال بعد ہی اسے پامال کر دیا گیا۔ 7 اور 8اکتوبر 1958ء کا فوجی انقلاب کوئی ایسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو سکا کیونکہ وہ ٹولہ جو پہلے بھی مقتدر حیثیت رکھتا تھا مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اس کی یہ حیثیت برقرار رہی البتہ 22اکتوبر کو ایک تبدیلی یہ آئی کہ جنرل ایوب خان نے اسی سکندر مرزا کو،جو کہ پاکستان کے لیے آمریت ہی کو موافق سمجھتا تھا، صدارت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور مرزا کو اپنی زندگی کے بقیہ دن لندن میں تارک الوطنی میں گزارنے پڑے۔

حمزہ علوی کہتے ہیں کہ سکندر مرزا کو جلا وطن کرنے کا اقدام امریکہ کے ایماء پر ہوا تھا کیونکہ امریکہ سوویت یونین کے قرب میں ایسا پاکستان دیکھنے کا خواہاں تھا جہاں پوری طرح سیاسی استحکام ہو مگر امریکی اربابِ بست و کشاد کو سکندر مرزا کی شخصیت قابلِ اعتبارنہ لگتی تھی۔ لہٰذا ایوب خان کو اس بات پر مائل کیا گیا کہ پاکستان کی باگ ڈور وہ تن تنہا سنبھالے۔ جب سکندر مرزا کی جلا وطنی عمل میں آئی تو اس وقت امریکی نائب وزیرِ دفاع پاکستان ہی میں موجود تھا۔[23]

ایوب خان کا دور تضادات سے پُر تھا۔ ابتدائی پانچ سالوں میں ایوب حکومت نے پاکستان کو ناقابلِ یقین اقتصادی ترقی سے ہمکنار کیا دوسرا پنج سالہ منصوبہ پاکستان کی کامیابی خوشحالی اور استحکام کی وجہ سے یاد گار ہے صنعت کاری اور اقتصادی ترقی کا تیسری دنیا میں نیا ریکارڈ قائم ہوا۔ جہاں یہ دورصنعت و حرفت میں ترقی کی علامت تھا وہیں سیاسی استبداد اور آمرانہ طرزِ حکومت کی شدت میں بھی اضافہ ہوااس دور میں ڈویلپمنٹ کے ایسے ماڈل کو اپنا یا گیا جس کا واحد مقصد اقتصا دی شرح میں اضا فہ کر نا تھا خواہ اسکے لیے کسی بھی طرح کی پالیسیا ں اپنانی پڑیں۔صنعتی اداروں میں مزدوروں کے سا تھ جو بھی سلو ک کر نا پڑے ایو ب حکو مت کیلئے وہ جا ئز تھا۔اس دو ر میں ایک ایسا آئین پاکستان پر مسلط کر دیا گیا جس میں تمام تر اختیارات کا ارتکاز صدر کی ذات میں کر دیا گیا تھا۔

صدر ایوب خان دنیا کے سب سے زیادہ بااختیار صدر تھے۔ 1962ء کے آئین کا مرکز و محور انہی کی شخصیت تھی ۔ اپنے مخالفین کا قلع قمع کرنے کے لیے EBDO [24]اورPODO [25]جیسے کالے قوانین وضع کیے گئے اور خاص طور پر سیاست دانوں کو E BDO کا نشانہ بنایا گیا۔ایوب خان کے دور میں جہاں ہاورڈیونیورسٹی کے اقتصادی ماہرین کے زیرِ ہدایت معاشی لبرل ازم کو رائج کیا گیا تھا وہیں سیاست کو جبرو استبداد کے سلاسل میں جکڑ کر رکھ دیا گیا۔ ڈویلپمنٹ کے مغربی سرمایہ دارانہ ماڈل کی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے کسی بھی طرح کی مخالفت کو سختی سے کچلنے کا اہتمام کیا گیا حتی کہ جیسے پہلے بھی ذکر ہوا فیکٹری مزدوروں کو ٹریڈ یونین بنانے یا ہڑتال کرنے کے حق سے یکسر محروم کر دیا گیا۔

جہاں تک ریاستی امور کا تعلق تھا تو ما ضی کی طرح اب بھی بیوروکریسی ہی ان امور کو نمٹانے میں فیصلہ کن کردار ادا کر رہی تھی۔ قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر ایسی چند مثالیں ہیں جو اس دور میں ایوب خان کے مشیرانِ خاص تھے۔ اخبارات کو سنسر کرنے اور پریس ٹرسٹ کو قائم کرنے جیسے بہیمانہ اقدامات انہی لوگوں کے مشوروں سے کیے گئے اس طرح جمہوریت اور اختلافِ رائے کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں۔ خا ص طو ر پر پا کستا ن میں با ئیں با زو کی تحریک اور ترقی پسند تحریک کی ہر طرح سے حو صلہ شکنی کی گئی۔ایوب خان کے آخری تین سال بحران اور انتشار

کا زمانہ تھا۔ خاص طور پر 1965ء کے انتخابات میں فاطمہ جناح کو جس طرح ریاستی مشینری کی مدد سے شکست دی گئی اس سے ایوب خان کی بطور حکمران ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔ ان انتخابات میں یوں تو کنونشن مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی لیکن یہ کامیابی بعد ازاں ایوب خان کے زوال کا ایک بڑا سبب بن گئی۔ 1965 ء کی جنگ کے بعد جب ایو ب خا ن معا ہدہ تا شقند پر دستخط کر آئے تو پا کستا ن میں انکا سیا سی مستقبل تا ریک سے تا ریک تر ہو تا گیا۔اِن کے مخا لفین نے جب یہ کہنا شروع کیا کہ ایو ب میدان میں جیتی ہو ئی جنگ میز پر ہا ر کر آ گیا ہے تو یہ اسکے لئے نو شتہ دیوار ثا بت ہوا۔مارچ 1969ء کو ایوب دور کا اختتام ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس آئین کے دن بھی پورے ہوئے جو فردِ واحد کو سامنے رکھ کر بنایا گیا تھا اور 1962ء میں نافذ کیا گیا ۔ ایک مرتبہ پھر فوجی حکومت نے طاقت کے زور پر ملک کو اپنے تسلط میں لے لیا۔[26]

جنرل یحییٰ خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر بن گئے۔ بظاہر حکومت تبدیل ہوئی تھی لیکن ریاست و حکومت پر قبضہ غیر سیاسی عناصر (بیوروکرسی۔فوج) ہی کا رہا۔ اس دوران آزادانہ و غیر جانبدارانہ انتخابات بھی نہ ہو سکے تھے اور نہ ہی متفقہ آئین بن سکا۔ جمہوریت کے لیے یہ دونوں عناصر بنیادی ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یحییٰ خان کے دنوں میں ایک عبوری آئین بنا اور پہلی مرتبہ آزادانہ انتخابات بھی ہوئے لیکن

بحیثیت مجموعی یحییٰ خان کا دور ابتلاء ، آمریت اور بے یقینی کا دور تھاجس میں اگر چہ ون یونٹ کو توڑ کر پنجاب، سندھ اور شمالی مغربی سرحدی صوبے کے سابقہ سٹیٹس کو بحال کر دیا گیا اور ساتھ ہی بلوچستان کو بھی صوبہ کا درجہ دے دیا گیا لیکن 1970ء کے انتخابی نتائج نے یحییٰ خان کیلئے مشکلات پیدا کر دی تھیں۔فوجی جرنیل ہونے کی وجہ سے وہ کسی بھی قیمت پر عوامی لیگ کو اکثریت حاصل کر لینے کے باوجود انتقالِ اقتدار پر راضی نہ تھا یحییٰ خان کے اس اقدام کا مشرقی پاکستان میں بہت ہی زبردست ردعمل ہوا اور صورت حال خانہ جنگی تک آن پہنچی ان حالات میں کوئی بھی سیاسی اقدام کرنے کی بجائے فوجی ایکشن کے ذریعے حالات کو سدھارنے کی کوشش کی گئی جو کہ پاکستان کی سالمیت کے لئے زہرِقاتل ثابت ہوئی اور 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان دولخت ہو گیا۔ اس طرح تاریخِ انسانی میں ایسا واقعہ رونما ہوا جس میں اکثریت نے اقلیت سے آزادی حاصل کرنے کی کامیاب جدوجہد کی۔جدید عہد میں یہ حقیقت ہے کہ سیاسی معاملات کو جب بھی انتظامی طریقوں سے سلجھانے کی کوشش کی جائے گی تو اس طرح کے بحران جنم لیتے رہیں گے۔

دسمبر 1971ء میں یحییٰ خان کو اقتدار چھوڑنا پڑا تب تک مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا اور پاکستانی قوم سوگ میں ڈوبی

تھی اس حالت میں ذوالفقار علی بھٹو سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ملکی سربراہ بنا۔ چونکہ روٹی ، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر بھٹو نے 1970ء کے انتخابات میں 82نشستیں حاصل کی تھیں لہٰذا کئی ایک اصلاحات کے ذریعے جہاں نچلے طبقات کو مقتدر حیثیت عطا کرنے کی کوششیں ہوئیں اور 1973ء کا آئین بھی متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا وہیں تمام ملکی وسائل کو قومیا کر ریاستی مرکزیت کو اور مضبوط کر دیا گیا۔ اقتدار سنبھالنے کے کچھ ہی عرصے بعد سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کو برطرف کر دیا گیا اور وہاں پر پیپلز پارٹی کی حکومت بنائی گئی جو کہ پاکستان کے پہلے منتخب سربراہ حکومت کی آمرانہ روش کی واضح مثا ل تھی۔ اپنے مخالفین کے ساتھ بھی بھٹو کا رویہ قطعاً غیر جمہوری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگاکر اقتدار حاصل کرلینے کے بعد پیپلز پارٹی اپنے منشور کے برعکس کچھ ہی عر صے میں بڑے زمینداروں کی نمائندہ جماعت بن کر رہ گئی۔ 1973ء کا آئین بیشک بھٹو کا کارنامہ تھا لیکن اس میں یکے بعد دیگرے سات ترامیم کر دینے کے بعد اس کی فیڈرل اساس کو بُری طرح سے مجروح کر دیا گیا۔ [27]لیکن بھٹو دور اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ماضی کی روایت سے کسی قدر انحراف کا دور تھا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ملکی باگ ڈور سیاسی شخصیت کے ہاتھ میں ہے البتہ فوج

کی تنظیم نو اور ایٹمی پروگرام وغیرہ کو شروع کر کے بھٹو نے بھی مضبوط مرکز کے حامی غیر سیاسی ریاستی اداروں کے ہاتھ مضبوط کرنے کی غلطی کی جس کا خمیازہ اسکے ساتھ ساتھ قوم کو بھی بھگتنا پڑا۔ عوام اور جمہوریت کا نام لینے والا بھٹو 4اپریل 1979 ء کو ایک متنازعہ مقدمہ قتل کے الزام میں پھانسی چڑھ گیا۔ اس سے پہلے 7جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے اس کا تختہ الٹ دیا تھا۔ ضیاء الحق کے عہد کے بنیادی خدوخال ضبطِ تحریر میں لائے جائیں تو یہ دور مذہبی رجعت پسندی اور فوجی آمریت کا سر اپا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور میں غیر سیاسی عناصر کے فسطائی رویے بھی نمایاں تھے۔ضیاء الحق نے اپنی اقتدار کو دوام دینے کے لیے بھٹو دور میں کسی حد تک جڑیں پکڑلینے والی پارٹی پالیٹکس کے صحت مندسیاسی رحجان کی حوصلہ شکنی کی۔ علاوہ ازیں جمہوریت اور خصوصاً پارٹی پالیٹکس کو خلافِ اسلام قرار دے کر اس کی مکمل بیخ کنی کی بھی ہر ممکن کوشش کی۔ سیاسی عناصر کے لیے یہ عہد جبر و استبداد سے عبارت تھا۔ سیاسی کارکنوں کو پابندِ سلاسل کیا گیا۔ اختلافِ رائے رکھنے والے صحافیوں کو کوڑے لگائے گئے۔ اپنی صدارت کی معیاد بڑھانے کیلئے ریفرنڈم کروایا گیا۔ جس میں ضیاء الحق کو ۹۷۔۷۰ فیصد ووٹ ملے۔یہ جمہوریت کے ساتھ گھناونا مذاق تھا۔

آئین کو آٹھویں ترمیم کے ذریعے اپنی مرضی و منشاء کے مطابق نئے سرے سے مرتب کر کے اختیارات میں عدم توازن پیدا کر دیا گیا۔ اور اس طرح جنرل ضیاء الحق گیارہ برس سے کچھ زیادہ عرصہ تک اپنے اقتدار کو طول دینے میں کامیاب تو ہو گئے، لیکن ان گیارہ سالوں کی جوقیمت اس قوم کو چکانا پڑی اس کا اندازہ لگانا انسانی ذہن کے بس میں نہیں ہے۔ سیاست میں نسلی تقسیم نیز فرقہ ورانہ رویوں کی ترویج جنرل ضیاء الحق ہی کے عہد کا شاخسانہ ہے جسے پاکستانی قوم آج بھی بھگت رہی ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اگر سیاست اور جمہوریت پر قدغن لگا دی جائے، سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی جائے اور انتخابات کو غیر جماعتی بنیادوں پر کروایا جائے تو سیاست میں نسل پرستی، مذہبی بنیاد پرستی اور تشدد جیسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ نیز انتخابات جیتنے کے لیے منشور کی بجائے روپے پیسے کے بے دریغ استعمال جیسے رحجانات معاشرتی اقدار میں سرایت کر جاتے ہیں ۔ 1985ء کے غیر جما عتی انتخا بات کے نتیجے میں پا رٹی پر و گر ام یا نظر یا تی سیا ست پر کا ری ضر ب لگی۔انتخا با ت میں حصہ لینے کیلئے واحد شر ط بے حسا ب دو لت کا ہو نا ہی قر ار پا ئی اور ان انتخا با ت کے بعد یہ لعنت پا کستا نی ریاست کا مستقل حصہ بن گئی ہے ۔ ضیاء الحق نے افغان جنگ میں امریکہ کے آلہ کار کی حیثیت سے حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں پا کستان منشیات اور

تشدد کا مرکز بن گیا۔ جس کا سب سے واضح اظہار یا تو مذہبی فرقہ پرستی کے نام پر باہمی قتل و غارت گری یا پھر اس کا اظہار کارزار سیاست میں ہوا۔ یہ ایسی قبیح روایات تھیں جو ہمارے ملک و معاشرے کے ساتھ ناسور کی طرح چمٹی ہوئی ہیں اور 17اگست1988ء میں ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو جانے کے بعد بھی ضیاء الحق کے چھوڑے ہوئے سیاسی ورثے کی یادگار ہیں۔

آج ضیاء الحق کو اس دنیا سے گزرے تقریباً 18سال ہو چکے ہیں لیکن ہمارے ہاں سیاست کو متعین کرنے والے اصول وہی ہیں جن کی ابتداء ضیاء الحق نے کی تھی۔ 1988 سے 1999 تک کا گیارہ سالہ عہد یوں تو جمہوری عہد کہلاتا ہے لیکن ملک کی تکمیل کے فیصلے غیر سیاسی اداروں کے مراکز میں ہوتے رہے۔ بے نظیر بھٹو جو 1988 کے الیکشن میں اکثریتی پارٹی کا سربراہ ہونے کے باوجود انتقالِ اقتدار کے لیے چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ اور امریکی سفیر رابرٹ اوکلے کی شرائط پر ہی وزیرِ اعظم بن سکی اور نواز شریف کے دونوں ادوار میں بھی صورتِ احوال اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ اگرچہ نواز شریف نے اپنے دوسرے عہد میں ترقیاتی کاموں پر توجہ دی اور چونکہ وہ متوسط طبقہ کا واحد منتخب وزیراعظم تھا لہٰذا سیاسی مبصرین کو اس کے اقتدار میں آنے سے یہ امید ہو چلی تھی کہ اب پاکستان میں پائیدار جمہوریت قائم ہو

جائے گی لیکن تمام اختیارات کا اپنی ذات میں ارتکاز اور ریاستی اداروں سے براہِ راست ٹکر لینے کی پالیسی اس کے اقتدار اور جمہوریت دونوں کو لے بیٹھی۔ 20ویں صدی میں مغل بادشاہ کی طرح حکومت کرنا اور حزبِ اختلاف کو اپنا جانی دشمن سمجھ لینا کسی بھی سیاسی رہنما کو زیب نہیں دیتا۔ سپریم کورٹ پر حملہ صدر فاروق لغاری کو مستعفٰی ہونے پر مجبور کر دینا نیز فوجی سربراہوں کو یکے بعد دیگرے معزول کر دینے کے اقدامات سیاسی و جمہوری تدبر سے قطعاً عاری تھے۔ نواز شریف کے لیے پاکستان میں جمہوریت کو مضبوط کرنے کا موقع تھا لیکن کچھ تو اس کی اپنی غلطیوں اور کچھ متجاوز ریاستی اداروں کی موقع پرستی نے جمہوریت کا پودا جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا۔

اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالا اور ابھی تک پاکستان کی تقدیر کے وہی مالک ہیں۔ 2002ء میں متنازعہ ریفرنڈم اور اس سے ذرا کم متنازعہ انتخابات کے ذریعے مسلم لیگ (ق) کی وزارت قائم ہوئی لیکن ریاستی امور کی نگرانی جنرل مشرف خود ہی کرتے ہیں۔ نچلی سطح پر انتقالِ اقتدار (devluation plan) باوردی صدر اور بے اختیار پارلیمنٹ و وزیرِ اعظم موجودہ جمہوری دور کے اہم خدوخال کہے جا سکتے ہیں۔ آئین کو ایک مرتبہ پھر سے ایک ہی شخصیت کو سامنے رکھ کر توڑا مروڑا گیا ہے۔ چنانچہ جمہوریت محض مذاق بن کر ہی رہ گئی ہے۔ اِس مقالے کو سمیٹتے

ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے لمحہء موجود تک پاکستان پر اصل اقتدار متجاوز سیاسی اداروں (over developed state institutions) ہی کا رہا۔ جس میں 1947ء سے 1958ء تک سول بیوروکریسی کا بول بالا رہا۔ جب کہ اس کے بعد سے فوج کا غلبہ رہا۔ اس میں ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت کے چند سال استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ جمہوری رویوں کو فروغ دینے کے لیے کسی بھی ملک میں سب سے اہم کردار Intelligentia یا دانشور طبقے کا ہوتا ہے جو کہ ضرورت پڑنے پر مزاحمتی کردار بھی ادا کرتے ہیں لیکن افسوس کہ آج پاکستان میں مزاحمت کا علم بلند کرنے والے دانشور ناپید ہیں۔

حوالہ جات

1۔ آئن ٹالبوٹ، پاکستان دی ماڈرن ہسٹری (وینگارڈ بکس لاہور، 1999ء)ص2

2۔ ایضاً ص 10

3۔ حمزہ علوی، پاکستان: ریاست اور اُس کا بحران (فکشن ہائوس لاہور،2002ء) ص 12،31

35، 254

4۔ ٹالبوٹ ص 55۔54

5۔ ایضاً

6۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سی اے بیلی ایمپائر اینڈ انفارمیشن،انٹیلی جنس گیدرنگ اینڈ سوشل کمیونیکیشن

1870ء۔1780ء (کیمبرج یونیورسٹی پریس کیمبرج 1999ء) ص179۔ 142

7۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: باربرا ڈی میٹکاف اینڈ تھامس آرمیٹکاف 'اے کنسائز ہسٹری

آف انڈیا' (کیمبرج یونیورسٹی پریس کیمبرج 2002ء) ص 114۔122

8۔ عائشہ جلال'سول سپوکس مین' جناح، دی مسلم لیگ اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان

(کیمبرج، 1985ء) ص 4

9۔ خالد بن سعید؛ پاکستان: دی فامیٹو فیز

1948ء۔1857ء(لندن۔1968ء)

10۔ عبداللہ ملک۔ پاکستان کی بنیادی حقیقتیں اور پاکستانی فوج کی ابتداء (لاہور، 1988ء) ص131

11۔ حمزہ علوی ص128

12۔ پنجاب ایڈمنسٹریٹو رپورٹ برائے 52۔1851ء صفحہ نمبر 45

13۔ احمد سلیم 'ٹوٹتی بنتی اسمبلیاں اور سول ملٹری بیوروکریسی' (جنگ پبلشرز، لاہور 1990ء) ص 147

14۔ ایضاً ص148

15۔ خان عبدالغفار خان 'آپ بیتی' (فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۴ء) ص 200۔ 204 احمد سلیم:

ص 108۔118

16۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: زاہد چوہدری، حسن جعفر زیدی، پاکستان کی سیاسی تاریخ جلدنمبر4،

جناح لیاقت تضادد اور پنجابی مہاجر تضاد (دارالمطالعہ تاریخ لاہور، 1988ء) ص 59

17۔ احمد سلیم، ص 122 تا 131

18۔ ایضاً ص 169

19۔ Public and Representative Offices Act (Disqualification)ٹالبوٹ ص xiv

20۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: عائشہ جلال دی سٹیٹ آف مارشل رول، دی اوریجنز آف

پاکستانز اکانومی آف ڈیفنس (کیمبرج، 1990ء)

21۔ احمد سلیم، ص 152۔151

22۔ تفصیل کے لیے دیکھیے چوہدری محمد علی 'ایمرجنس آف پاکستان' (ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان)

23۔ حمزہ علوی ص 142۔141

24۔ Elected Bodies (Disqualification) Order ٹالبوٹ ص xiii

25۔ Public Offices (Disqualification) Order ایضاً ص xiv

26۔ ایضاً ص 179۔148

27۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: اے ایچ سید، 'زیڈ اے بھٹو سیلف کیریکٹر ازیشنز اینڈ پاکستانی پولیٹیکل کلچر'، ایشین سروے 18، نمبر 12 (دسمبر 1978ء)

اس کے علاوہ بھٹو کے حوالے سے نمائندہ تحریریں درج ذیل ہیں:

محمود شام، لاڑکانہ سے پیکنگ تک، کراچی 1972ء

یونس ادیب قائدِ عوام، لاہور 1972ء

قاضی ذوالفقار احمد اور رانا محمود الحسن، ذوالفقار علی بھٹو، لاہور 1973ء بعد ازاں سٹینلے واپرٹ کی تصنیف زلفی بھٹو آف پاکستان جو 1992ء میں چھپ کر سامنے آئی۔